30

جو اپنے بزرگوں کی عزت کرانا چاہتے ہیں ان کو چاہیئے کہ دوسروں کے بزرگوں کی بھی عزت کریں

(فرمودہ 22 نومبر 1940ء)
(غیر مطبوعہ)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"اس ہفتہ میں بعض ایسے واقعات ہوئے ہیں جن سے ہماری جماعت کے بعض احباب کے دلوں میں بعض حکّام یا دوسری اقوام کی نسبت شکوہ پیدا ہؤا ہے۔ اس لئے میں آج ان امور کے متعلق اپنے خطبہ میں بعض باتیں کہنی چاہتا ہوں۔ گزشتہ اتوار کو سکھوں کا ایک جلسہ قادیان کے پاس کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہؤا تھا اور اس جلسہ کے موقع پر ان کی طرف سے ایک جلوس نکالا گیا تھا جو کہ اپنا رستہ چھوڑ کر سٹیشن سے پہلے قادیان میں داخل ہؤا پھر جو بڑا ہندو بازار کہلاتا ہے اور جس میں اب بہت سی دکانیں احمدیوں کی بھی ہیں میں سے ہوتا ہؤا اس بازار سے جو چھوٹا بازار کہلاتا ہے گزرا اور پھر قصبہ کے اوپر سے ہوتا ہؤا اس گلی میں سے جو عام طور پر شیخ یعقوب علی صاحب والی گلی کہلاتی ہے گزرا اور پھر دارالانوار سے ہوتا ہؤا جلسہ گاہ کو گیا۔ جب اس جلوس کی تجویز جماعت کو معلوم ہوئی تو جماعت کے ذمہ دار افسروں نے حکّام کو توجہ دلائی کہ جن بازاروں میں سے جلوس کو گزارنے کی تجویز ہے وہ اصل رستہ نہیں۔

اصل رستہ باہر سے جاتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے شہر کی گلیوں میں سے گزارا جائے اور پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان گلیوں سے اسے گزرنے کی اجازت دی جائے جن میں کثرتِ آبادی احمدیوں کی ہے۔ حکّام نے اس اعتراض کو قبول نہ کیا کہ کوئی وجہ نہیں اسے شہر کی گلیوں میں سے گزارا جائے اور کہا کہ شہروں کی گلیاں چلنے پھرنے کے لئے ہوتی ہیں اور اس لئے ہم لوگوں کو ان میں چلنے سے کیسے روک سکتے ہیں۔ البتہ اسے ان علاقوں سے نہیں گزرنے دیا جائے گا جن میں کثرت آبادی احمدیوں کی ہے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ جلوس مغرب سے ہوتا ہوُا شمال کی طرف چلا جائے گا اور پھر باہر ہی باہر مشرق کی طرف جلسہ گاہ میں پہنچ جائے گا۔ مگر جب وہ مغربی رستہ کو طے کر کے شمال کی طرف پہنچا تو حکّام کے تجویز کردہ رستہ کو اختیار کرنے کی بجائے پولیس کی صفوں کو توڑ کر احمدی محلّوں کی طرف ہو گیا۔ یہ بات حکّام کے وعدہ کے سراسر خلاف تھی اور اس وجہ سے بعض دوستوں کو شکوہ پیدا ہوُا ہے اور انہوں نے اظہارِ رنج کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری نسبت حکام کے لئے زیادہ اظہار رنج کا موجب ہے جنہوں نے پہلے ایک بات کہی اور پھر ان کی آنکھوں کے سامنے اسے توڑ دیا گیا۔ پہلے تو پولیس لائن بنا کر ان کے سامنے کھڑی ہوئی اور پھر معاً ان کے آگے آگے چل پڑی۔ یہ قانون شکنی کا ایسا مظاہرہ ہے جس سے حکام اور حکومت دونوں کی عزت قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جو ڈنڈا دکھائے حکومت اس کے آگے جھک جاتی ہے۔ ایسی حکومت جو اپنے احکام کی پابندی نہیں کرا سکتی اسے قانون اور انتظام کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ قانون اور انتظام کو ہاتھ میں رکھنے کا دعویدار وہی ہو سکتا ہے جو اپنے احکام کا نفاذ بھی کرا سکے۔

حکام اور اہلِ جلوس کی یہ جنگ ایسی ہی تھی جیسے کہتے ہیں کہ کسی جگہ کوئی پٹھان تھا جس کی مونچھیں بہت بڑی بڑی تھیں اور اس کا دعویٰ تھا کہ اس جگہ مونچھیں رکھنے کا حق صرف مجھ کو ہی ہے۔ اور وہ شہر میں سب کو ڈراتا تھا کہ خبردار اگر کسی نے مونچھیں اونچی کیں۔ انسانی فطرت ہے کہ جس بات سے اسے روکا جائے اس کی طرف وہ ضرور مائل ہوتا ہے اور مقابلہ کرتا ہے۔ اور جب تک طبائع خود مائل نہ ہوں اس بات کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اس لئے کئی لوگوں نے مونچھیں اونچی رکھنی شروع کیں مگر اس نے ہر ایک کو دو دو تین تین تھپڑ لگائے۔

اس لئے سب نے ڈر کر یہ خیال چھوڑ دیا۔ وہاں ایک جولاہا زیرک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے کئی دنوں تک مونچھوں کو اونچا رکھنے کی مشق کی اور پھر ایک روز تلوار ہاتھ میں لے کر بازار میں ٹہلنے لگا۔ کسی نے اس پٹھان کو بھی جا بتایا کہ آج ایک اور شخص بھی مونچھیں اونچی کئے پھر رہا ہے۔ یہ سن کر وہ آیا جونہی اسے دیکھا آگے بڑھ کر کہا کہ اپنی مونچھیں نیچی کرو۔ یہاں میرے سوا کوئی شخص مونچھیں اونچی نہیں رکھ سکتا۔ جولاہے نے جواب دیا کہ اب تو یہاں میری مونچھیں ہی اونچی رہیں گی اور کسی کی نہیں۔ پٹھان نے کہا کہ اچھا آؤ پھر تلوار سے فیصلہ کر لیں کہ کسے اونچی رکھنے کا حق ہے۔ جولاہے نے کہا کہ اس طرح ٹھیک نہیں۔ مقابلے میں دونوں میں سے ایک ضرور مارا جائے گا اور مصیبت اس کے بیوی بچوں پر پڑے گی اور وہ بھوکے مریں گے جو ظلم ہے۔ پٹھان نے پوچھا کہ پھر اس کی تدبیر کیا ہے؟ جولاہے نے جواب دیا کہ پہلے ایسا کریں کہ تم اپنے بیوی بچوں کو مار آؤ اور میں اپنوں کو مار آتا ہوں پھر فیصلہ کریں گے۔ پٹھان فوراً جوش کی حالت میں چلا گیا اور جا کر سب کو قتل کر دیا لیکن جولاہا وہیں کسی دکان پر بیٹھ کر اس کا منتظر رہا۔ جب وہ واپس آیا تو اس سے دریافت کیا کہ کیا تم سب کو مار آئے ہو؟ پٹھان نے کہا کہ ہاں میں تو مار آیا ہوں۔ تم بھی مار آئے ہو؟ تو اس نے کہا کہ نہیں۔ تمہارے جانے کے بعد میری رائے تو بدل گئی تھی اور لو میں مونچھیں نیچی کر لیتا ہوں۔

یہی حال یہاں حکام کا ہوا ہے۔ حکومت کے دبدبہ کو قائم رکھنے کے لئے حکام کا فرض یہ ہے کہ یا تو وہ کوئی حکم دیں نہیں اور اگر دیں تو پھر اس کی تعمیل کرائیں۔ ایسا نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوتا جاتا ہے کہ حکومت ڈراوے کو مانتی ہے اور اس لئے جو دوسری قومیں ہوں ان میں بھی یہ جوش پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی ذرا حکومت کو ڈرائیں۔ چنانچہ پچھلے سالوں میں جب حکومت کے ساتھ ہمارے اختلافات تھے ہماری جماعت کے بعض لوگ مجھے بار بار لکھتے تھے کہ آپ ہمیں کچھ کرنے کی اجازت دیں کیونکہ یہ حکومت دھمکی کے بغیر مانا نہیں کرتی۔ مگر میں مشکل سے ان کو روکتا تھا اور اس اشتعال کا باعث دراصل حکام کے بعض ایسے ہی احکام تھے جن کی وہ تعمیل نہیں کرا سکتے تھے۔ اس موقع پر بھی اگر سکھوں کے بجائے کوئی اور قوم ہوتی تو حکام اسے ضرور مجبور کرتے کہ ہمارا حکم مانو مگر سکھوں سے وہ دب گئے۔

یہ واقعہ ان ہزاروں لوگوں کے سامنے ہؤا جو جلوس میں شامل تھے اور ان سینکڑوں لوگوں نے دیکھا جو تماش بین کی حیثیت سے موجود تھے اور انہوں نے اس بات کو دیکھا کہ حکام اپنے فیصلہ کو منوا نہیں سکے بلکہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ ان کے احکام کو توڑا جا رہا تھا اور ان کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کو روک سکیں۔ یہ واقعہ ان ہزاروں لوگوں کے دلوں میں لازماً یہ احساس کرانے کا موجب ہؤا ہو گا کہ حکّام بالکل بے بس ہیں اور ان میں اپنے احکام کی تعمیل کرانے کی طاقت نہیں اور ایسے احساسات سے ملک کے آئندہ امن پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ حکومت ملک میں ہونے والے فسادات پر ہمیشہ شکوہ کرتی ہے اور ہم بھی کرتے ہیں۔ بلکہ ہر شریف ہندو، سکھ، مسلمان اور احمدی کو ان پر افسوس ہے اور حکومت ان کو روکنا بھی چاہتی ہے اور اس کے لئے کوشش بھی کرتی ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ جب تک اس کے احکام کے پیچھے وہ روح نہ ہو جس کی وجہ سے نظام کا ادب لوگوں کے دلوں میں قائم ہوتا ہے امن کا قیام ممکن بھی ہے؟ اگر حکّام ایسے ہی حکم دیتے رہیں جنہیں وہ منوا نہ سکیں تو تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بدنامی ہو جائے گی۔ اور اس کے لئے ملک میں امن قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

پچھلے دنوں جب کانگرس نے انفرادی سول نافرمانی کا اعلان کیا تو میں نے ایک سرکاری آفیشل سے یہ بیان کیا کہ حکومت کو یہ مشورہ دینا چاہئے کہ شروع میں ہی وہ طریقِ عمل اختیار کرے جس پر بعد میں قائم رہ سکے۔ اور اگر اس نے بعد میں اپنی بات پر قائم نہیں رہنا تو اسے چاہئے کہ کانگرس کی بات ابھی مان لے۔ اس سے اس کی عزت رہ جائے گی۔ لیکن اگر وہ مقابلہ کے لئے کھڑی ہو گئی اور گاندھی جی نے برت رکھ لیا اور تاریں آنے لگیں کہ ان کی جان جا رہی ہے، ان کی بات فوراً مانی جائے۔ اور اس لئے اسے مان لیا تو پہلے ہی اس کی کافی بے رُعبی ہو رہی ہے اس سے اور بھی ہو جائے گی۔ اس لئے اسے چاہیئے کہ پہلے ہی سوچ لے کہ وہ مقابلہ کر سکتی ہے یا نہیں۔ اگر سول نافرمانی شروع ہوئی تو گاندھی جی روزہ تو ضرور رکھیں گے اور اگر اس نے پھر اپنی بات کو چھوڑ دینا ہے تو یہی بہتر ہے کہ پہلے ہی مقابلہ شروع نہ کرے اور یا پھر یہ فیصلہ کرے کہ گاندھی جی خواہ زندہ رہیں اور خواہ مریں وہ اپنی بات پر قائم رہے گی۔ اگر سِول نافرمانی شروع ہوئی تو عدمِ تعاون کرنے والے حکومت کا مقابلہ کریں گے اور حکومت

ان کا کرے گی۔ اور یہ تو پتہ ہی ہے کہ اس صورت میں گاندھی جی روزہ ضرور رکھیں گے اور اگر پھر اس نے ان کی بات کو مان لینا ہے تو اس لڑائی کے شروع کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ میں تو ہمیشہ سے حکومت کو یہی مشورہ دیتا رہا ہوں کہ وہ حکام کے اچھی طرح ذہن نشین کر دے کہ وہ وہی حکم دیں جسے پورا کرا سکیں۔ سوائے اس کے کہ ان پر واضح ہو جائے کہ ان کا حکم ناواجب تھا۔ ایسی صورت میں ضرور ان کو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ان کی غلطی تھی اور اپنے حکم کو واپس لے لینا چاہیئے۔ مگر یہ امر کہ حکم کو توڑا جائے اور وہ خاموش رہیں اس کی بے رُعبی کا موجب ہے اور ملک میں فسادات کو بڑھانے والی بات ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں جو فسادات ہوں گے ان کی ذمہ داری حکومت پر بھی ہو گی۔ جس زمانہ میں سر مائیکل اڈوائر گورنر تھے اس وقت سے میں یہ بات پیش کر رہا ہوں کہ ایجی ٹیشن سے دَبنا ملک میں فسادات کا موجب ہے۔ بعض لوگ حکومت کے پاس ایک معقول شکایت لے کر جاتے ہیں مگر وہ جواب دیتی ہے کہ اس کے متعلق تو کوئی ایجی ٹیشن نہیں۔ اس صورت میں ان لوگوں کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ پہلے جا کر ایجی ٹیشن کرائیں۔ حالانکہ اگر بات معقول ہو تو حکومت کو چاہیے کہ اسے پہلے ہی مان لے اور اس کے متعلق ایجی ٹیشن کا انتظار نہ کرے۔

ہمارے پاس یہ قیاس کرنے کے وجوہ ہیں کہ یہاں جو انتظام ہؤا وہ لوکل حکام کی طرف سے نہ تھا بلکہ بالا افسران کے مشورہ سے ہؤا۔ ممکن ہے یہ خیال غلط ہو مگر ہمارے پاس اس کے وجوہ ہیں۔ اس صورت میں حکومت کو یہاں اتنی کافی پولیس بھی بھیجنی چاہیے تھی جو انتظام کر سکتی اور اس کے حکام کے احکام کی تعمیل کرا سکتی۔ جلوس میں ہزاروں لوگ ٹکوے، تلواریں اور لاٹھیاں ہؤا میں لہرا رہے تھے جس کے معنے یہ تھے کہ ہم چیلنج کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں 25 یا 50 پولیس مین ان کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ یا پھر یہ چاہئے تھا کہ حکام حکم ہی وہ دیتے جو منوا سکتے۔ احکام دے کر ان کی تعمیل نہ کرا سکنے کے یہ معنے ہیں کہ کچھ لوگ تو یہ سمجھیں کہ حکومت کمزور ہے اور وہ اپنی بات کو منوا نہیں سکتی اور کچھ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ اگر حکومت سے کوئی بات منوانی ہو تو اسے لٹھ دکھانا چاہیئے۔ اور ایسے خیالات حکومت اور ملک دونوں کے لئے مُضر ہیں بلکہ حکومت کی نسبت یہ خیالات ملک کے لئے زیادہ

مُضر ہیں۔ حکومت کرنے والے انگریز تو یہاں باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ اگر حالات بدل جائیں تو وہ تو بوریا بستر اٹھا کر یہاں سے چلے جائیں گے اور ملک میں جو طوائف الملوکی اور فسادات پھیلیں گے ان کا اثر زیادہ تر ہندوستان پر ہو گا۔ بہر حال یہ شکوہ ہمارے دلوں میں پیدا ہونے کے بجائے حکام کے دلوں میں زیادہ پیدا ہونا چاہیئے اور میں حکومت کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ہمیشہ وہی بات کہے جسے منوا سکے ورنہ نہ کہے۔ اس طرح گو احکام کم دیئے جا سکیں گے مگر حکومت کی عزت ضرور قائم ہو جائے گی۔ اس موقع پر بھی مثلاً حکام اگر ہم سے کہہ دیتے کہ ہم بے بس ہیں، سکھوں کا زور ہے تو اغلب ہے کہ ہم کہہ لیتے اچھا ان کو گزرنے دیا جائے اور اس طرح لوگوں پر بُرا اثر بھی نہ ہوتا اور حکومت کی عزت بھی رہ جاتی۔ پھر حکام نے یہ جو دلیل دی کہ لوگ گلیوں سے گزرتے ہی ہیں اور اس سے کسی کو کیسے روکا جا سکتا ہے درست نہیں۔ جلوس سارے ملک میں نکلتے ہیں اور ہر جگہ اس کے لئے رستے مقرر ہیں۔ انفرادی طور پر لوگوں کا گزرنا اور بات ہے لیکن جلوسوں کا گزرنا اور ہے۔ اور ہر جگہ جلوسوں کے لئے رستے مقرر ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ سارے ملک میں تو جلوسوں کے متعلق اور قانون ہو اور قادیان میں اَور۔ ہم برابر دیکھ رہے ہیں کہ جب کوئی ایسا موقع ہوتا ہے تو حکام کہہ دیتے ہیں کہ باہر جو قانون استعمال ہوتا ہے وہ غلط ہے لیکن باہر والے کہتے ہیں کہ یہاں جو ہوتا ہے وہ غلط ہے۔ اب کون سی عدالت ہے جس سے اس امر کا فیصلہ کرایا جا سکے کہ جس قانون پر باہر عمل ہوتا ہے وہ صحیح ہے یا جس پر یہاں ہوتا ہے۔ یا تو ہر جگہ اور ہر قوم کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ جس شہر میں اور جس رستہ سے چاہے اپنا جلوس گزار سکے اور یا پھر قادیان میں بھی رستہ مقرر ہونا چاہیئے۔ کیا جلوس صرف قادیان میں ہی نکلتے ہیں؟ ہر شہر میں جلوس نکلتے ہیں۔ امرتسر لاہور، دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، الٰہ آباد، ہر جگہ نکلتے ہیں اور بیسیوں واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں کہ کسی شہر میں ہندوؤں نے کسی رستہ سے جلوس گزارنا چاہا لیکن مسلمانوں نے نہ گزرنے دیا یا مسلمانوں نے گزرنا چاہا تو ہندوؤں نے نہ گزرنے دیا۔ تو ہر جگہ جلوسوں کے رستے مقرر ہیں لیکن قادیان میں یہ جواب دیا جاتا ہے کہ گلیاں لوگوں کے گزرنے کے لئے ہی ہوتی ہیں اور ہم کسی کو کس طرح گزرنے سے روک سکتے ہیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ سب جگہ کے لئے ایک ہی

قانون ہو۔ یا تو ہر جگہ ہر قوم کے جلوس کو سب رستوں سے گزرنے کی اجازت ہونی چاہیئے اور یا پھر قادیان میں بھی رستے مقرر ہونے چاہئیں۔ اگر امنِ عامہ کے پیش نظر باہر جلوسوں کے رستوں کو مقرر کرتے وقت وہ بعض اصول مدنظر رکھتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قادیان میں ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ سب جگہ کے لئے ایک ہی قاعدہ ہو اور سب کو اطلاع دے دی جائے کہ یہ دستور ہے۔ ہم اقلّیت میں ہیں۔ وہ جو بھی قاعدہ مقرر کرے اس پر اعتراض کا ہمیں کوئی حق نہیں اور ہمیں منظور ہو گا۔ خواہ وہ یہ کر دے کہ ہر جگہ ہر قوم کے جلوس کو ہر بازار سے گزرنے کا حق ہے۔ اور یا پھر یہ کہ بعض شرائط کے ماتحت رستے مقرر ہو سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے اس کے متعلق کوئی مطالبہ نہیں لیکن یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ ہر جگہ ایک ہی قانون ہو۔ یہ درست نہیں کہ لکھنؤ، کلکتہ، میرٹھ، لاہور یا امرتسر کے لئے تو قانون دوسرا ہو اور قادیان کے لئے دوسرا۔

دوسری بات جو اس ضمن میں مَیں کہنی چاہتا ہوں یہ ہے کہ اس کانفرنس کے متعلق جو اشتہار شائع کیا گیا اس میں ہم پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ ہم قادیان کے نواحی علاقہ میں دس دس میل تک اپنی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے حکومت کو تین کروڑ روپیہ دیا جائے گا۔ بعض نے احتیاط کی تو یہ کہا ہے کہ ایک کروڑ دیا جائے گا۔ ہماری مالی حالت ظاہر ہے۔ ہمارا بجٹ مجلس شوریٰ میں پیش ہوتا ہے اور اس پر بحث کی جاتی ہے۔ وہ کوئی مخفی چیز نہیں۔ اور اسے دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت بھی جماعت پر دو لاکھ سے زیادہ روپیہ کا بار ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہم کارکنوں کا قلیل معاوضہ بھی جو گزارہ کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے بعض اوقات تین تین یا چار چار ماہ تک ادا نہیں کر سکتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو قرض لے کر۔ اور اگر قرض نہ لیا جائے تو شاید ایک سال کی تنخواہیں بقایا میں رہیں۔ ان حالات میں کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ہم تین کروڑ یا ایک کروڑ ہی حکومت کو دے سکتے ہیں۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا حکومت اس طرح کروڑوں روپے لے کر علاقے دیا کرتی ہے۔ کیا اس کی کوئی ایک مثال بھی پائی جاتی ہے؟ جب تک تو انگریزی حکومت باقاعدہ قائم نہیں ہوئی تھی اس وقت تو بعض ایسے سودے ہوئے ہیں مثلاً کشمیر کا صوبہ ایک کروڑ روپیہ میں دے دیا گیا تھا۔ سکھوں پر

تاوان لگایا گیا اور اسے موجودہ مہاراجہ کے دادا کے ذمہ لگا کر یہ علاقہ دے دیا گیا۔ اور پھر تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ روپیہ ادا بھی ہؤا۔ ممکن ہے کچھ ہؤا ہو اور جب کشمیر جیسا بڑا علاقہ ایک کروڑ میں بکا تو قادیان کے ارد گرد دس میل کا علاقہ جسے آج جبکہ موٹر کاریں اور گاڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں انسان پھونک مار کر پار کر جاتا ہے تین کروڑ میں لے کر کوئی کیا کرے گا۔ دس میل کے علاقہ کی آبادی میرے نزدیک 30۔35 ہزار ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار سہی۔ اس سارے ضلع کی آبادی دس لاکھ ہے۔ اس میں سے احمدیوں کی آبادی تو بہت ہی تھوڑی ہے۔ اس دس میل کے علاقہ میں احمدی میرے نزدیک بارہ تیرہ ہزار یا زیادہ سے زیادہ چودہ ہزار ہوں گے جو ساری آبادی کا چوتھا یا تیسرا حصہ ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنی اقلّیت ایسی کثرت پر حکومت کیونکر آسانی کے ساتھ کر سکتی ہے۔ اس زمانہ میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو ملک تباہ ہوئے ہیں انہیں غیر ملکی اقلیتوں نے ہی تباہ کیا ہے اور ایسی اقلیتیں جو اِن کی تباہی کا باعث بنیں بیس فیصدی سے زیادہ نہ تھیں۔ مگر انہوں نے حکومت کا قافیہ ایسا تنگ کیا کہ وہ ٹوٹ گئی۔ ان حالات میں احمدی کیونکر یہ امید کر سکتے ہیں کہ اتنی بڑی اکثریت پر کامیابی سے حکومت کر سکیں گے۔ ہم پر الزام لگانے والے ذرا خود سوچیں کہ وہ کیا چیز پیش کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میں نے اس سے انکار کیوں نہیں کیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ہمیں ایسی بات کی تردید کی ضرورت کیا ہے جو ہو ہی نہ سکتی ہو۔ اگر کل کو کوئی کہہ دے کہ میں نے ہٹلر کو گھر میں چھپا رکھا ہے تو کیا میرا فرض ہے کہ اس کی بھی تردید کروں۔ ایسی باتیں ملک میں بدامنی کا موجب ہوتی ہیں۔ اور قیامِ امن کا ذمہ دار مَیں نہیں حکومت ہے۔ اور اس کا جواب دینا اس کا فرض تھا اور تردید بھی اسے کرنی چاہیئے تھی۔ ہم اگر کہیں کہ ہم ریاست نہیں لیتے تو افسر کہہ سکتے ہیں کہ بیوقوفو تمہیں دیتا کون ہے۔ پس نہ تو ہم مانگتے ہیں اور نہ کوئی دیتا ہے۔ اس لئے ہم انکار کیوں کریں۔ ہاں حکومت کا فرض تھا کہ اعلان کرتی کہ یہ بات غلط ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ سکھوں میں کئی ایسے لوگ ہیں جو موجودہ کانسٹی ٹیوشن کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ انگریزوں کو یہ حق ہی نہیں کہ کسی کو کوئی علاقہ دے دیں۔ صرف وزراء کی مرضی سے ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ آخر یہ کوئی مذہبی بات تو ہے نہیں بلکہ قانون کا سوال ہے۔ اور ان کے ہاں بھی

قانون کے ماہر موجود ہیں۔ چاہئیے تھا کہ ان سے پوچھتے کہ انگریزوں کو اس کا حق بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ وزراء بھی نہیں دے سکتے۔ پہلے کوئی ایسی بات اسمبلی میں پیش ہو گی۔ اوپر ہی اوپر یہ بات ممکن ہی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سر ظفر اللہ خان صاحب نے وائسرائے سے اوپر ہی اوپر یہ بات منوالی ہے۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ وائسرائے کو پنجاب کے معاملات میں دخل کا کوئی حق ہی نہیں۔ اب ہر صوبہ آزاد ہے۔ پنجاب گورنمنٹ چاہے تو دے سکتی ہے۔ مگر وہ بھی خود نہیں بلکہ پہلے اس بات کو اسمبلی میں بطور مسوّدہ پیش کرے گی اور پھر اس کی منظوری سے کوئی ایسی بات کر سکتی ہے۔ یہ بات تو ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ موضع بُٹر کا فلاں لالہ ریاست پٹیالہ فلاں ساہوکار کو دے رہا ہے۔ بھلا اسے ریاست پٹیالہ پر دخل ہی کیا ہے۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا

اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاْسًا وَّنَاوِلْھَا

دوسرا مصرعہ حافظ کے ایک شعر کا ہے جو فارسی کا مشہور شاعر تھا اور "زلیخا" جامی کی تصنیف ہے۔ مگر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ سعدی نے زلیخا میں کیا خوب لکھا ہے کہ ساقی پیالہ ادھر لا اور اسے گردش دے۔ حالانکہ سعدی نے زلیخا لکھی ہی نہیں۔ پس پنجاب کا کوئی علاقہ کسی کو دینے کا اختیار حکومت ہند کو ہے ہی نہیں بلکہ پنجاب گورنمنٹ کو بھی نہیں۔ اسمبلی کو ہے۔ اس میں بھی ایسا مسودہ پیش کرنے کے لئے پہلے غالباً حکومت ہند سے منظوری لینی ضروری ہے۔ پس نہ حکومت کو دینے کا اختیار ہے نہ لینے والوں کے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے۔ یہ تو محض پروپیگنڈا ہے جو بعض احراری ملانوں نے سکھوں میں اشتعال پیدا کرنے کے لئے کیا ہے اور سکھ ان کے دھوکا میں آگئے۔ چاہئیے تو یہ تھا کہ جب انہوں نے یہ بات ان کے سامنے پیش کی تھی تو وہ ان سے کہتے کہ کیا تم ہم کو بیوقوف سمجھتے ہو۔ ماسٹر تارا سنگھ صاحب سکھوں کے بڑے لیڈروں میں سے ہیں ہمارے آدمی ان سے ملنے گئے اور جب ان کو یہ بات بتائی تو وہ ہنس پڑے اور کہا کہ ریاست تو بادشاہ بھی نہیں دے سکتا۔ تو سکھوں نے اسے پیش کر کے عقلمندوں کو اپنے اوپر ہنسی کا موقع دیا ہے۔ باقی رہا تردید کا سوال سو وہ حکومت کو کرنی چاہیئے تھی،

ضلع کے افسروں کو کرنی چاہیئے تھی کیونکہ جس بات سے امن میں خلل کا احتمال ہو حکومت کا فرض ہے کہ اس کی تردید کرے۔ جب لاہور میں مسجد شہید گنج گرائی گئی تو یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ چودھری افضل حق صاحب نے حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر شہید گنج کو مسجد سے گوردوارہ میں تبدیل کر دیا جائے تو مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اس وقت حکومت نے اس خبر کی تردید کی تھی۔ اور جب چودھری افضل حق صاحب کی عزت کی حفاظت حکومت نے ضروری سمجھی تو کیا ضلع کے امن کے پیش نظر اس کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ اس افواہ کی تردید کرتی۔

پھر اس جلسہ میں سلسلہ کے متعلق بھی بہت کچھ کہا گیا۔ سخت اشتعال انگیز نظمیں پڑھی گئیں اور تقریریں کی گئیں۔ اور اگر سکھ ایسی باتوں کو اس وجہ سے جائز سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلہ میں زیادہ ہیں تو ان کو مسلمانوں پر اعتراض کا کیا حق ہے؟ اور وہ پاکستان کی مخالفت کس اصول کے ماتحت کرتے ہیں؟ اگر وہ محض اس وجہ سے کہ وہ ہم سے زیادہ ہیں ہم کو گالیاں دے سکتے ہیں تو مسلمان اگر ان سے یہی سلوک کریں تو ان کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ تمام شرفاء ہندو، سکھ، مسلمان ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ اگر امن قائم رکھنا ہے تو وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ سب کے جذبات کا خیال رکھا جائے اور اس بات کی بنیاد عقل پر ہے۔ کسی کو دوسرے پر زیادتی کا حق محض اس وجہ سے نہیں دیا جا سکتا کہ اس کی تعداد دوسرے کی نسبت کچھ زیادہ ہے۔ تھپڑ مارنا صرف بچے کے لئے ہی ناجائز نہیں بلکہ پہلوان کے لئے بھی ناجائز ہے۔ یہ جبر ہے کہ پہلوان تو تھپڑ مار سکتا ہے مگر بچہ نہیں مار سکتا۔

ایک شخص نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزا صاحب گیدڑ تھے (نعوذ باللہ) کیا یہ انصاف کی بات ہے؟ ان کے گُروؤں کے متعلق اگر کوئی شخص یہی بات کہے تو کیا وہ برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا وہ ایسی باتیں کہنے میں اپنے آپ کو اس وجہ سے حق بجانب سمجھتے ہیں کہ ان کے اس علاقہ میں نوے گاؤں ہیں یا پنجاب میں ان کی تعداد تیس لاکھ ہے اور احمدی تھوڑے ہیں۔ یہ بات بالکل غیر موزوں ہے اور میں سمجھتا ہوں خود ان کی قوم کے شرفاء بھی اسے قابلِ اعتراض قرار دیں گے۔ اگر ہم سے زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو ہمارے بزرگوں کے متعلق ایسے الفاظ

کا حق ہے تو ان سے زیادہ تعداد والوں کو ان کے بزرگوں کے متعلق بھی ایسے الفاظ استعمال کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو گیدڑ کہنے سے ان کے گُروؤں کی عزت بڑھ جاتی ہے؟ ایسی باتوں کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ اگر ہم بھی دوسروں کی طرح ہوں تو فساد ہو جائے۔ اسی طرح بعض اور بھی گندے الفاظ استعمال کئے گئے۔ ایسے گندے کہ جن کو انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اس کی وجہ جواز اُن کے لئے سوائے اس کے اور کیا ہے کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں لیکن اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ لیکن یہ بات انصاف کے سراسر خلاف ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ شیر کو گیدڑ کہنے سے وہ گیدڑ بن نہیں جاتا۔ جس طرح کہ سورج کو رات کہنے کا کوئی اثر نہیں وہ برابر طلوع کرتا رہتا ہے۔ جسے خدا تعالیٰ نے شیر بنایا ہے کسی کے گیدڑ کہنے سے اس کی شیری میں فرق نہیں آ سکتا۔ گیدڑ وہی احراری ہیں جو سکھوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں کیونکہ وہ سب لوگ جو اس وقت احمدی ہیں حضرت مرزا صاحب انہی میں سے چھین کر لائے ہیں۔ وہ اکیلے تھے جب انہوں نے دعویٰ کیا اور پھر اکیلے نے سارے ہندوستان پر غلبہ پایا۔ روحانیت سے حملہ کر کے کسی دنیوی حملہ سے نہیں اور لاکھوں کو ان مولویوں کے پنجہ سے چھین کر لے آئے۔ ان سے پوچھا جائے کہ کیا گیدڑ ایسے ہی ہوتے ہیں؟ آپ کے شیر ہونے کی علامت روزانہ الفضل میں شائع ہوتی ہے کہ آج اتنے احمدی ہوئے، آج اتنے ہوئے۔ دنیا میں کوئی ایسا شیر نہیں جو تین چار سو سے زیادہ شکار سال میں کر سکتا ہو مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام ہر سال چار پانچ سو آدمیوں کو ان لوگوں سے چھین لیتے ہیں اور ایسے وقت میں لاتے ہیں جب آپ فوت ہو چکے ہیں۔ ہم تو ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور ہمیں یقین ہے کہ خود ان میں سے شریف طبقہ بھی اس کی تردید کرے گا۔ انہیں خود سوچنا چاہیئے کہ اگر ان گالیوں کا دسواں حصہ بھی ان کے گُروؤں کے متعلق استعمال کیا جائے تو ان کی کیا حالت ہو گی؟ ان کو غصہ آئے گا یا نہیں؟ اگر وہ اپنے بزرگوں کی عزت کرانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ دوسروں کے بزرگوں کی بھی عزت کریں۔

بعض تقریروں میں کہا گیا ہے کہ ہمارا خاندان اس علاقہ کا قاضی تھا اور

مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب نے ہمارے دادا کو جائداد دی تھی۔ ممکن ہے یہ کہنے والا باہر سے آیا ہو مگر اس علاقہ کے بڑے بوڑھوں سے دریافت کرو کہ ہمارا خاندان قاضی تھا یا حاکم۔ اگر ہمارے بزرگ ملانے تھے تو کیا سکھوں کی چار مسلیں اکٹھی ہو کر مُلانوں سے مقابلہ کے لئے آئی تھیں۔ سکھوں کی کل مسلیں پندرہ سولہ تھیں جن میں سے چار نے مل کر قادیان پر حملہ کیا تھا اور اب بھی بسراواں میں قلعوں وغیرہ کے نشانات ہیں جن پر توپیں وغیرہ نصب کی گئی تھیں۔ کیا یہ چار پانچ مسلیں مل کر کسی مسجد کے امام یا مُلا سے مقابلہ کے لئے آئی تھیں۔ ہمارا خاندان خدا تعالیٰ کے فضل سے پہلے سے اس علاقہ کا حاکم تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب کا زمانہ تو بعد کا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب کی ہتک کی ہے۔ مگر یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ میں نے سکھ تاریخ پوری طرح نہیں پڑھی مگر میرے دل میں مہاراجہ صاحب کی عزت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ان کی تعریف سنی ہے۔ جن سکھوں کے خلاف آپ نے لکھا ہے وہ طوائف الملوکی کے زمانہ کے تھے اور ایسے زمانہ کو ہر قوم بُرا کہتی ہے۔ اور خود سکھ بھی بُرا سمجھتے ہیں۔ مگر جب مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب نے ایک منظم حکومت قائم کر لی تو اس زمانہ کی میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے تعریف ہی سنی ہے اور اس وجہ سے میرے دل میں ان کی عزت ہے۔ انہوں نے ایک معمولی زمیندار کا فرزند ہو کر ایسی عقلمندی دکھائی کہ پنجاب میں ایک منظم حکومت قائم کر دی۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ ہم ان کی ہتک کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لکھا ہے کہ مہاراجہ صاحب نے ہی یہ گاؤں واپس کیا۔ پس جن کو بُرا کہا گیا ہے وہ طوائف الملوکی کے زمانہ کے سکھ ہیں۔ بے شک مہاراجہ صاحب نے یہ گاؤں واپس کیا لیکن ہمارے خاندان نے بھی ہمیشہ ان کے خاندان سے وفاداری کی۔ جب انگریزوں سے لڑائیاں ہوئیں تو بعض بڑے بڑے سکھ سرداروں نے روپے لے لے کر علاقے انگریزوں کے حوالہ کر دیئے اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کی جاگیریں موجود ہیں۔ یہاں سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر سکھوں کا ایک گاؤں بھاگووال ہے وہاں سکھ سردار ہیں مگر وہ بھی انگریزوں سے مل گئے تھے۔

تو اس وقت بڑے بڑے سکھ خاندانوں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا اور مہاراجہ کے خاندان سے غداری کی مگر ہمارے دادا صاحب نے کہا کہ میں نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے اس سے غداری نہیں کر سکتا۔ کیا وجہ ہے کہ سکھ زمینداروں کی جاگیریں تو قائم ہیں مگر ہماری چھین لی گئی۔ اس غصہ میں انگریزوں نے ہماری جائداد چھین لی تھی کہ ہمارے دادا صاحب نے سکھوں کے خلاف ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔

تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ مہاراجہ صاحب نے سات گاؤں واپس کئے تھے۔ پھر وہ کہاں گئے؟ وہ اس وجہ سے انگریزوں نے ضبط کر لیے کہ ہمارے دادا صاحب نے ان کا ساتھ نہ دیا تھا اور کہا تھا کہ ہم نے مہاراجہ صاحب کی نوکری کی ہے ان کے خاندان سے غداری نہیں کر سکتے۔ بھاگووال کے ایک اسّی پچاسی سالہ بوڑھے سکھ کپتان نے مجھے سنایا کہ میرے دادا سناتے تھے کہ ان کو خود سکھ حکومت کے وزیر نے بلا کر کہا کہ انگریز طاقتور ہیں ان کے ساتھ صلح کر لو خواہ مخواہ اپنے آدمی مت مرواؤ مگر ہمارے دادا صاحب نے مہاراجہ صاحب کے خاندان سے بے وفائی نہ کی اور اسی وجہ سے انگریزوں نے ہماری جائداد ضبط کر لی۔ بعد میں جو کچھ ملا مقدمات سے ملا مگر کیا ملا قادیان کی کچھ زمین دے دی گئی۔ باقی بھینی، ننگل اور کھارا کا مالکانِ اعلیٰ قرار دے دیا گیا۔ مگر یہ ملکیت اعلیٰ سوائے کاغذ چاٹنے کے کیا ہے؟ یہ برائے نام ملکیت ہے جو اشک شوئی کے طور پر دی گئی۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے دادا صاحب نے غداری پسند نہ کی۔ ہاں جب انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی تو پھر ان سے وفاداری کی ہے۔ پس یہ تعریف کے قابل بات تھی۔

سکھ لیکچراروں کو کہنا چاہئیے تھا کہ ہمارے دادا صاحب نے مسلمان ہونے کے باوجود سکھوں سے غداری نہیں کی مگر کہا یہ گیا کہ وہ گھاس منہ میں لے کر مہاراجہ صاحب کے پاس پہنچے کہ کچھ دیا جائے۔ یہ کہنے والے کو معلوم نہیں کہ ہمارے پاس آج تک وہ تحریر موجود ہے جو شاہ فرخ سِیر نے ہمارے پر دادا صاحب کو لکھی ہے اور اس میں ان کو عضد الدولہ کا خطاب اور سات ہزار فوج رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔ اگر ہماری جاگیر مہاراجہ صاحب کی دی ہوئی ہے تو ان سے بہت پہلے یہ مناصب کیونکر حاصل ہو گئے۔ فرخ سِیر تو اورنگ زیب سے قریبی زمانہ

میں گزرے ہیں۔ پس ایسی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہؤا کرتا۔ سینکڑوں لوگ ابھی تک اس علاقہ میں ایسے موجود ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادوں سے سنا ہو گا کہ ہمارا خاندان یہاں مُلّاں تھا یا حاکم۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ جب ملتان کے صوبہ نے بغاوت کی تو ہمارے تایا صاحب نے ٹوانوں کے ساتھ مل کر اسے فرو کیا تھا اور اسی وقت سے ٹوانوں اور نون خاندان کے ساتھ ہمارے تعلقات چلے آتے ہیں۔ پس جہاں تک شرافت کا سوال ہے ہمارے خاندان نے سکھ حکومت سے نہایت دیانتداری کا برتاؤ کیا اور اس کی سزا کے طور پر انگریزوں نے ہماری جائداد ضبط کرلی۔ ورنہ سری گوبندر پور کے پاس اب تک ایک گاؤں موجود ہے جس کا نام ہی مغلاں ہے اور وہاں تک ہماری حکومت کی سرحد تھی اور اس علاقہ کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں تک ہماری حکومت تھی۔ اور یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب سے پہلے کی بات ہے۔ آج اگر گالیاں دی جائیں تو اس سے کچھ نہیں بنتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہم اس علاقہ کے حاکم تھے اور سکھوں کا قادیان پر حملہ کرنا ہی بتاتا ہے کہ یہاں حکومت تھی۔ ہمارے دادا صاحب کپورتھلہ کی ریاست میں چلے گئے تو مہاراجہ کپورتھلہ نے ان کو دو گاؤں پیش کئے۔ گو انہوں نے لئے نہیں مگر کیا ایسے تحفے مُلانوں کو پیش کئے جاتے ہیں؟ اسی احراری مُلاں سے پوچھو کہ آج بھی وہاں کسی مُلانے کو دو گاؤں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ عنایت اللہ صاحب خود ملاں ہیں اور قاضی بھی کہلاتے ہیں۔ پھر ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا سارے علاقہ پر رعب ہے۔ وہ خود وہاں چلے جائیں اور دیکھ لیں کہ مہاراجہ کپورتھلہ ان کو دو گاؤں پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ اس طرح ملانوں کو دو دو گاؤں دینے لگیں تو دو سال میں ان کی ریاست ختم ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ 3، 4 سو گاؤں اس ریاست میں ہوں گے اور اگر وہ دو دو گاؤں تقسیم کرنے لگیں تو دو سو روز میں ان کی ریاست ختم ہو جائے۔ پس ایسی باتوں سے جو تاریخ اور عقل دونوں کے خلاف ہوں کچھ فائدہ نہیں۔ بات وہ کرنی چاہئیے جو تاریخ اور عقل کے مطابق ہو اور جس سے امن پیدا ہوتا ہو۔ ہم ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہیں اس لئے ہمارے درمیان فساد والی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ کسی کا یہ خیال کرنا کہ احمدی تھوڑے ہیں اور کوئی قوم ان کو مار سکتی ہے اور ان کے مکان اور جائدادیں تباہ کر سکتی ہے بالکل غلط خیال ہے۔ ایک بچہ کو بھی اگر زبردست پہلوان کنویں میں پھینکنا چاہے تو

وہ بھی مقابلہ کرتا اور اسے دق کر دیتا ہے۔ پھر ہمارا تو کسی طاقت پر بھروسہ نہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا حافظ ہے۔ تلواروں، ٹکوؤں اور لاٹھیوں کا رُعب ہمیں دبا نہیں سکتا۔ اور نہ ہم کسی کو دبانا چاہتے ہیں۔ گو یہ لوگ ہمارے شدید دشمن ہیں مگر ہم پھر بھی ان سے اور ان کی اولادوں سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے ان پر غلبہ ضرور حاصل کرنا ہے مگر تلوار یا بندوق سے نہیں بلکہ دلائل اور پیار سے۔

تقریروں میں کہا گیا ہے کہ ہم ظلم کرتے ہیں مگر میں کہتا ہوں جا کر علاقہ میں سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں سے پوچھو کہ ہم ان پر کیا ظلم کرتے ہیں۔ علاقہ کے سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہمارا لین دین ہے۔ ہم ان سے برابر چیزیں خریدتے ہیں۔ قادیان میں حالات مختلف ہیں۔ اگر ان کو اس وجہ سے غصہ ہے کہ ہم یہاں کے بعض ہندو اور سکھ دکانداروں سے بعض چیزیں نہیں خریدتے تو ان کو ہندوؤں پر غصہ کیوں نہیں آتا جنہوں نے ایک لاکھ سال سے دوسری قوموں سے سودا وغیرہ خریدنا بند کر رکھا ہے۔ پہلے ان کو چاہئے کہ اس ظلم کو دور کریں۔ بہادر قوم ہمیشہ بڑا کام کیا کرتی ہے۔ سکھ بھی اپنے آپ کو بہادر کہتے ہیں اس لئے ان کو چاہیے کہ پہلے ہندوؤں کے اس ظلم کو دور کریں اور اس ناانصافی کا خاتمہ کریں جو وہ اتنے لمبے عرصے سے کر رہے ہیں۔ ہم کسی جگہ کوئی دکان کھولتے ہیں ہم پر اعتراض کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو لائیں کہ وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں یہ بات موجود ہے کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں سے کھانے پینے کی چیزیں نہیں خریدتے اور جب سارے ملک میں یہ بات موجود ہے تو ان کا سارا غصہ قادیان پر ہی کیوں ہے۔ اگر اس وجہ سے وہ قادیان کے مکانات گرانے پر آمادہ ہوتے ہیں تو ان کا اولین فرض ہے کہ پہلے بنارس کی دکانیں اور مکانات گرائیں، کاشی کے گرائیں، بمبئی میں گرائیں جہاں ہندو محلّوں میں مسلمانوں کو کرایہ پر بھی مکانات نہیں دیئے جاتے۔

میں ایک دفعہ بمبئی گیا تو وہاں رہنے کے لئے کرایہ پر مکان ملنا مشکل ہو گیا مہاراجہ اندور 1 کے پرائم منسٹر وہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کا مکان جو ساحل سمندر کے پاس تھا۔ حضرت اماں جان میرے ساتھ تھیں اور وہ بیمار تھیں۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ ساحل کے قریب کسی

مکان میں رہیں۔ میں اندور کے پرائم منسٹر صاحب کے پاس گیا اور پوچھا کہ آپ کب تک یہاں رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رہنا تو ابھی پندرہ روز اور تھا مگر آپ کو ضرورت ہے اور آپ ہمارے علاقہ کے رئیس ہیں (وہ پنجاب کے رہنے والے تھے) اس لئے میں آپ کی خاطر پہلے ہی مکان خالی کر دیتا ہوں۔ مگر جب ہمارے آدمی سامان وغیرہ رکھنے کے لئے گئے تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ محلہ کے سارے ہندو جمع ہو کر میرے پاس آئے ہیں کہ آپ ایک مسلمان کو مکان دینے لگے ہیں۔ پس جن لوگوں کو ہم پر غصہ آتا ہے اور اس وجہ سے ہمارے مکان ڈھانا چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ پہلے بمبئی جا کر وہاں کے ہندوؤں کے مکانات ڈھائیں۔ پھر قادیان پر ان کا حملہ اچھا لگے گا۔ ہم نے قادیان میں جو بعض پابندیاں لگا رکھی ہیں وہ بعض مخصوص حالات کی وجہ سے ہیں اور ان کا مقصد صرف امن قائم رکھنا ہے۔ ہم نے یہ محض اس شرارت کی وجہ سے لگا رکھی ہیں جو یہاں کے ہندو اور سکھ دکانداروں نے ایک مرتبہ کی تھی کہ اپنی دکانوں کا سامان باہر پھینک کر مشہور کر دیا کہ احمدیوں نے ہماری دکانیں لوٹ لی ہیں۔ ورنہ سکھ دیہات میں جا کر پوچھو کہ ہم سکھوں سے چیزیں لیتے ہیں یا نہیں۔ قادیان میں خاص معاملہ ہے جس کی وجہ انہیں دریافت کرنی چاہیے تھی۔ اور اگر یہ ظلم ہے تو یہ ظلم سارے ہندوستان میں ہندو اور سکھ کر رہے ہیں۔ ان کو چھوڑ کر صرف ہم پر حملہ کرنے کی وجہ کیا صرف یہ ہے کہ ہم تھوڑے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں علاقہ کے ہندوؤں اور سکھوں کے اخلاق اور انصاف کا تقاضا تھا کہ وہ خود بخود ان باتوں کی تردید کرتے اور اب بھی انصاف اور اخلاق ان سے ان باتوں کی تردید کا تقاضا کرتے ہیں۔ کیا گاؤں کے سِکھ سِکھ نہیں ہیں؟ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ قادیان کے سکھوں کی نسبت وہ زیادہ پکے سکھ ہیں۔ وہ زیادہ قربانیاں کرتے ہیں۔ قادیان کے سکھ ہمیشہ ان سے امداد حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان کے زیادہ پکے سکھ ہونے کے باوجود ہم ان کے ساتھ کیوں معاملات کرتے ہیں۔ پس قادیان کے سکھوں اور ہندوؤں سے اگر ہم چیزیں نہیں لیتے تو یہ اور بات ہے اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہے۔ ورنہ ہم سکھوں اور ہندوؤں سے برابر لین دین کرتے ہیں اور ہمیں خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ بعض ایسے دیہات میں جہاں احمدیوں کی کثرت ہے سکھ رہتے ہیں۔ ضلع سیالکوٹ میں بعض ایسے گاؤں ہیں اور بعض سکھ جلسہ سالانہ

کے موقع پر یہاں آتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ احمدیوں کے گاؤں میں ہمارے لئے بڑا امن ہے۔ اگر ہم سکھوں کے دشمن ہوتے تو ان دیہات میں ان سے بُرا سلوک کیوں نہ کرتے؟ پس ہر شریف سکھ اور ہندو کا فرض ہے کہ ان باتوں کی تردید کرے۔ وہ اس امر کے عینی شاہد ہیں کہ ہم کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتے۔

اس موقع پر میں جماعت کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ اشتعال میں ہرگز نہ آئے۔ سکھوں کو ایک یہ رعایت حاصل ہے کہ ہم ان کے گُروؤں کو بزرگ سمجھتے ہیں اور اس لئے ان کو بُرا نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے بزرگوں کو وہ جو گالیاں دیتے ہیں ان کا غصہ اتارنے کا یہی طریق ہو سکتا تھا کہ ہم بھی ان کے بزرگوں کو انہی الفاظ سے یاد کرتے مگر ہم تو حضرت بابا نانکؒ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ ہم ان کو گالی کس طرح دے سکتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ دو بھائی آپس میں لڑیں۔ ایک ماں کی گالی دے تو دوسرا اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری گالی میری ماں کو لگے گی۔ پس ہمیں یہ مجبوری ہے۔ یہ بہت بیوقوفی ہوگی کہ ایک طرف تو ہم اپنے بزرگوں کو سکھوں سے گالیاں دلوائیں اور پھر خود اپنے بزرگوں کو گالیاں دیں۔ پس ان حالات میں ہمارے لئے سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں کیونکہ بدلہ کا جو طریق ہے اسے ہم اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم رام اور کرشن کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ ہندو رسول کریم ﷺ کو گالیاں دیتے ہیں مگر ہم ان کے بزرگوں کو گالی نہیں دے سکتے کیونکہ وہ ہمارے بھی بزرگ ہیں۔ پس ہمارے لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب ہم اپنے کسی بزرگ کو گالی سنتے ہیں اور غصہ کے باوجود ان کے کسی بزرگ کو گالی اس لئے نہیں دیتے کہ خدا تعالیٰ کے ایک بزرگ کی اس طرح ہتک ہوتی ہے۔ تو ہمارا خدا ہمیں ضرور اس کا اجر دے گا۔ پس ہمارے لئے افسردگی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ہم نے غصہ کے باوجود خدا تعالیٰ کے لئے اپنی زبان کو روکا اور اس وقت گالی نہ دی جب ہم دے سکتے تھے۔ محض اس وجہ سے کہ اس سے خدا تعالیٰ کے ایک بزرگ کی توہین ہوتی ہے اور اس صبر کا اجر ہمیں اللہ تعالیٰ ضرور دے گا۔ پس صبر کرو اور دوسروں سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کا مظاہرہ کرو۔ ممکن ہے تم میں سے کسی نے پہلے کسی ہندو یا سکھ سے بُرا سلوک کیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو آئندہ بہت احتیاط کرو۔ قادیان کے حالات جیسا کہ میں نے

بتایا ہے مختلف ہیں۔ لیکن بعض دکانوں سے سودا خریدنے کی ممانعت کے باوجود یہاں کے ہندوؤں اور سکھوں سے بھی محبت کا سلوک کرو۔ کوئی ہندو، سکھ یا غیر احمدی بھوکا ہو تو اس کے لئے بھی کھانے کا اسی طرح فکر کرو جیسا اپنے احمدی بھائی کے لئے کرتے ہو۔ کوئی ننگا ہو تو اس طرح اس کے لئے بھی کپڑے کا خیال رکھو۔ میرا اپنا معاملہ تو یہ ہے کہ میں نے سکھوں کو تعلیمی وظائف بھی دیئے ہیں۔ انہیں گھر کے اخراجات کے لئے بھی امداد دی ہے۔ بعض اوقات کفن دفن کے اخراجات بھی دیئے ہیں۔ پس ہندوؤں سے بھی میں ویسا سلوک کرتا رہا ہوں۔ گو کسی کے نام کا اظہار مناسب نہیں کہ اس طرح ہتک ہوتی ہے۔ پس آپ لوگوں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ یہاں کے ڈاکٹروں اور طبیبوں کو ہندو اور سکھ مریضوں کا اسی طرح علاج کرنا چاہیئے جس طرح احمدیوں کا کرتے ہیں۔ قادیان میں بھی اور باہر بھی ان سے اچھا ہی سلوک کرنا چاہیئے۔ ان سے لین دین میں کوئی روک نہیں اور گو اس طرح ہمارا پیسہ ان کے گھروں میں جاتا ہے مگر اس کی کوئی پرواہ نہ کرو کہ وہ بھی ہمارے ویسے ہی بھائی ہیں جیسے احمدی یا دوسرے مسلمان۔" (از ریکارڈ خلافت لائبریری ربوہ)

---

1 **اندور:** ہندو مہاراجوں کی سابق ہندوستانی ریاست جو ہندوستان کے تقریباً وسط میں واقع تھی۔1948ء میں مدھیہ پردیش میں ضم ہوگئی۔اندور شہر میں بہت سے کالج اور ایک خوبصورت محل ہے۔یہ محل مہاراجہ کے استعمال میں تھا۔(اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ 140 مطبوعہ لاہور1987ء